تطہیر فکر و عمل میں مکتوبات امام ربانی کا منہج: ایک جائزہ

Methodology adopted by Sirhindi in *Maktūbāt* for purity of thought and action: An analysis

محمد عظیم فاروقی *

Abstract

Sheikh Aḥmad Sirhindi (971-1034AH) titled as Mujaddid Alf Thāni (Reformer of the second thousand years) made excellent use of epistle-writing at his time for reinforcement of the teachings of Qur'ān andSunnah. These letters known as Maktūbāt have indeed gained a special place among the letters of Sufi sheikhs in the history of the subcontinent. Imām-e-Rabbāni wrote five hundred and thirty six (536) letters to one hundred and ninty two (192) recipients including nobles of his time, religious scholars, spiritual leaders, his authorised disciples, followers, men and women and to his Spiritual Guide (Murshad), Ḥaḍrat Khawāja Bāqi Billāh of Delhi. He culminated this art of epistle-writing to its climax. His letters played a vital role to reform the Indian society of his time in all fields of human interest. These epistles are still usefull and impressive. The present article throws light upon practical and intellectual impacts of his letters on elite class of his time and on his successors.

Keywords: Sheikh Aḥmad Sirhindi, Mujaddid Alf Thāni, Methodology of Maktūbāt, Sufi Terminology

شیخ احمد سرہندی المعروف امامِ ربّانی حضرت مجدد الف ثانی(971-1034ہجری)کے تجدیدی کارناموں اور مساعی جمیلہ کے نتائج واثرات سینکڑوں برسوں پر محیط ہیں۔ آپ کی جملہ کاوشوں میں کلیدی وبنیادی کردار آپ کے مکتوباتِ ہیں، جو اسلام کی نشاۃِ ثانیہ اور احیائے دین وملت کے امین ثابت ہوئے اور فکر و عمل میں عظیم انقلاب کا پیش خیمہ بنے۔ آپ ہی وہ واحد شخص ہیں جنہوں نے عالمِ مشرق کو بیدار کرنے اور انسانیت کو ایک مرکز پر لانے کے لئے اکبر جیسے مطلق العنان حکمران کے سامنے توحید کا نعرہ بلند کیا۔ اس دوران آپ نے مختلف ہستیوں کو خطوط تحریر فرمائے، آپ کے یہ خطوط نسخہ ءکیمیا ہیں۔ اور آپ کے مقام اور انقلابی پیغام کے مکمل طور پر آئینہ دار ہیں۔ ان خطوط کو "مکتوبات امامِ ربانی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ "مکتوبات امامِ ربانی" فارسی زبان میں تین جلدوں پر مشتمل ہیں۔ موجودہ دور میں اس قسم کے متعدد اردو تراجم دستیاب ہیں۔ بعض ناشرین نے یہ مکتوبات تین جلدوں میں اور بعض نے دو جلدوں میں شائع کئے ہیں۔ ہر جلد کو ایک دفتر قرار دیا گیاہے۔ ذیل میں ہر ایک کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے:

1۔ دفتر اول: اس میں تین سو تیرہ (۳۱۳) مکتوبات شامل ہیں اور یہ "دار المعرفت" کے نام سے موسوم ہے جس کو حضرت مجدد الف ثانی کے مرید خاص حضرت خواجہ یار محمد بدخشی نے مرتب کیا۔

2۔ دفتر دوم: اس میں ننانوے (۹۹) مکتوبات شامل ہیں۔ اس کا تاریخی نام "نور الخلائق" ہے۔ اس دفتر کے مؤلف مرتب حضرت خواجہ عبد الحی ہیں۔

3۔ دفتر سوم: اس دفتر میں ایک سو چوبیس (۱۲۴) مکتوبات ہیں۔ یہ دفتر "معرفت الحقائق" سے موسوم ہے۔ اس دفتر کے مرتب آپ کے مریدانِ خاص میر محمد نعمان اور خواجہ محمد ہاشم کشمی ہیں۔[1]

* سینئر انسٹرکٹر، گورنمنٹ کالج آف کامرس، راولپنڈی

حضرت مجدّد الف ثانی نے تصوف میں غیر اسلامی عقائد و نظریات و اعمال کو داخل ہونے سے روکنے کی بھرپور کوشش کی۔ آپ کے دور میں صوفیاء کے دلوں میں "وحدت الوجود" کا نظریہ سرایت کر چکا تھا۔ آپ نے اس نظریہ کو براہین و دلائل سے توحید کا ابتدائی تصور ثابت کیا اور اگلا اور حقیقی تصورِ توحید "نظریہ وحدت الشہود" پیش کیا۔ آپ کے دور کے لوگ اعتدال سے گزر کر افراط کی طرف قدم بڑھا رہے تھے۔ آپ نے لوگوں کا رخ شریعت کی طرف موڑ دیا اور آنے والے ادوار میں امتِ مسلمہ کے فکر و عمل کا قبلہ درست رکھنے کے لئے آپ کی شخصیت اور مکتوبات سنگ میل ثابت ہوئے۔

نیکی اور بدی کے درمیان کشمکش ایک عالمگیر حقیقت ہے اور تاریخ انسانی میں کوئی بھی دور ایسا نہیں گزرا جس میں حق اور باطل باہم دست و گریباں نظر نہ آتے ہوں۔ مقولہ مشہور ہے کہ "ہر فرعون کیلئے موسیٰ بھی ہوتا ہے"۔ ایسے ہی برصغیر پاک و ہند میں ایک ایسا نازک دور بھی آیا جس میں مغلیہ خاندان کے عظیم فرمانروا جلال الدین محمد اکبر نے اپنے اقتدار کو استحکام و دوام بخشنے کے لئے غیر اسلامی قوانین کے ساتھ آئین اکبری اختراع کر لیا، جس کے خاتمہ کے لئے شیخ احمد سرہندی المعروف امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی میدانِ عمل میں نکلے اور اپنی ہمہ جہت کاوشوں کے ذریعے ہندوستان کے مسلمانوں کا قبلہ درست کرنے میں کافی حد تک کامیاب ہو گئے۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ عصرِ حاضر کے جملہ سیاسی، مذہبی، روحانی، فکری اور عملی رجحانات کی تصویر کشی کی جائے اور مکتوباتِ مجدّد الف ثانی کی روشنی و رہنمائی میں ان کا کافی اور شافی منطقی حل تلاش کیا جائے تاکہ امتِ مسلمہ ایک وحدت میں پروئی جا سکے اور دینِ اسلام کے پیرکاروں کو حالاتِ حاضرہ کے تناظر میں فکر و عمل کی بہتر راہیں میسر آسکیں۔

امامِ ربانی حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات نہ صرف قرآن و سنت کی تعلیمات کا خلاصہ و نچوڑ ہیں بلکہ آپ کے دور کی ایک مستند ترین تاریخی دستاویز بھی ہے، جن سے کماحقہ استفادہ کرنے کے لئے اب تک متعدد کاوشیں ہو چکی ہیں۔ متعدد فضلاء اور علماء اس پر کام کر رہے ہیں۔ تقریباً چار سو سال گزر جانے کے باوجود آپ کی تعلیمات و افکار زندہ و پائندہ ہیں۔ مکتوبات فہمی ایک مشکل ترین فن ہے۔ پھر مکتوبات مجدد الف ثانی میں بعض ایسے دقیق مسائل ہیں جن کی تہہ تک پہنچنے کے لئے آپ کے عہد کی تاریخ، اس دور کے سیاسی، معاشرتی، مذہبی و فکری مسائل، ہندومت کے احیاء کی تحریکوں، آپ کے معاصرین اور معاصر کتب جیسے زبدۃ المقامات اور حضرات القدس وغیرہ[2] کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ آپ کے صاحبزادگان کے مکتوبات کے مجموعہ جات اور مجدد الف ثانی کے مشکل مکتوبات کی شرح و حواشی کا مطالعہ بھی از حد ضروری ہے۔

مکتوبات فہمی کے حوالے سے ذیل میں چند ایک شخصیات کا ذکر کیا جاتا ہے:

1. مفتی محمد باقر نے مکتوبات مجدد الف ثانی کی عبارات کو موضوعی ترتیب سے یکجا کیا،[3] جن کے عربی میں بھی ترجمے چھپ چکے ہیں۔
2. شیخ محمد مراد شامی (م ۱۱۳۲ھ) نے عربی زبان میں مکتوباتِ مجدد کا ترجمہ کیا تھا، جس سے بعد میں ترکی زبان میں ترجمے ہوئے تھے۔[4]
3. حضرت مجدد الف ثانی کے پوتے شیخ عبد الاحد وحدت (معروف شاہ گل متوفی ۱۱۲۶ھ) نے بھی مکتوبات کی شرح لکھی تھی۔[5]
4. معروف ترک خطاط اور عالمِ مستقیم زادہ سعد الدین سلیمان نقشبندی نے (۱۱۶۲ھ تا ۱۱۶۵ھ) مکتوبات کا ترکی زبان میں ترجمہ کیا اور افکارِ مجدد ترکی میں پھیلانے کا ذریعہ ثابت ہوئے۔[6]
5. اردو زبان میں قاضی محمد عالم دین اور مولانا محمد سعید نقشبندی (لاہور) کے تراجم قابلِ ذکر ہیں۔ اور مولانا محمد سعید احمد مجددی (گوجرانوالہ) نے "البینات شرح مکتوبات" کے نام سے مکتوباتِ امامِ ربانی کے دفتر اوّل کے تقریباً سو سے زیادہ مکتوبات کا ترجمہ و

شرح تحریر کی ہے۔[7]

مکتوباتِ مجدد الف ثانی و صاحبِ مکتوبات پر گزشتہ پچپن سال میں دنیا کی مختلف یونیورسٹیوں میں تقریباً ایک درجن ریسرچ سکالرز پی ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کر چکے ہیں۔ اور متعدد محققین، تحقیق و تفہیم میں مصروف ہیں جن میں مفتی محمد باقر لاہوری اور شیخ عبد الاحد وحدت سرہندی کی شروحات و تخریجات قابلِ ذکر ہیں۔ اس کے بعد ضیاء المقدمات لمطالعۃ المکتوبات (۱۳۴۰ھ) مؤلفہ از مولانا ضیاء الدین وزیر اچکزائی، شرح مکتوبات امام ربانی (فارسی نثر) از مولوی نصر اللہ ہوتکی، مکتوبات امام ربانی کی دینی و معاشرتی اہمیت از ڈاکٹر سراج احمد خان بن ڈاکٹر غلام مصطفی خان کا پی ایچ۔ڈی کا مقالہ، البینات شرحِ مکتوبات از مولانا محمد سعید احمد مجددی، تبریز المکتوبات فی تخریج احادیث المکتوبات از حضرت شاہ عبد الغنی مجددی (۱۲۳۴۔۱۲۹۶ھ) بن حضرت شاہ ابو سعید مجددی، تشید المبانی فی تخریج احادیث مکتوبات الامام الربانی از مولانا محمد سعید (مطبع فتح الکریم حیدرآباد دکن) ۱۳۱۱ھ، پروفیسر ڈاکٹر بیولر کی نقشبندی سلسلہ پر امریکہ میں پی ایچ۔ڈی، مکتوبات مجدد الف ثانی، تخریج احادیث از بابر بیگ مطالعی کا پی ایچ۔ڈی کا مقالہ (پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۹۵ء) شعبہ علوم اسلامیہ، مکتوباتِ مجدد الف ثانی کے تفسیر و فقہ پر اثرات از ڈاکٹر ہمایوں عباس شمس کا پی ایچ۔ڈی کا مقالہ (بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی) وغیرھم بھی اس سلسلہ میں قابلِ ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ امریکہ کے جواں سال نو مسلم محقق سالم عبد اللہ کے فہارس تحلیلی ہشتگانہ مکتوبات احمد سرہندی مرتبہ (Arthur F. Bucher) بھی محققین کے لئے مفید و مؤید ثابت ہو رہی ہے۔[8]

مکتوبات مجدد کی علمی و فکری جلالت اس قدر ہمہ گیر، ہمہ جہت اور زماں و مکاں کی حدود پر محیط ہے کہ اس پر صدیوں لکھنے لکھانے اور سننے سنانے کی ضرورت محسوس ہوتی رہے گی۔ اور امتِ مسلمہ اس منبع رُشد و ہدایت سے فیض یاب ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔[9]

موجودہ صدی میں پاک وہند کے مسلمان بالخصوص اور پوری دنیا کے مسلمان و غیر مسلم بالعموم جن مسائل سے دوچار ہیں۔ اگر مکتوبات مجدد کی روشنی میں اُن کا فکری و عملی حل تلاش کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ اُن ہمہ گیر مسائل کو حل نہ کیا جاسکے اور مسلمان اقوام عالم کے لئے فکر و عمل کا دوبارہ مینارہ ہدایت ثابت نہ ہو سکے۔

اس موجودہ خلفشار، بدامنی اور بے چینی کے روح فرسا ماحول میں مکتوبات مجدد کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ جن حالات میں یہ مکتوبات لکھے گئے وہ موجودہ حالات سے کہیں زیادہ خوفناک، تباہ کُن اور ایمان سوز تھے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ موجودہ حالات کے تناظر میں مکتوبات کی روشنی میں فکر و عمل کے لئے قرآن و سُنت کی منشاء کے مطابق راہیں متعین کی جائیں اور عالم اسلام کو موجود فکری و عملی خلفشار سے نکال کر "ہو تا ہے جادہ پیماں پھر کارواں ہمارا" کا نعرہ مستانہ لگائیں۔

تطہیر فکر و عمل کا منہج:

مکتوبات امام ربانی فکر و عمل کی پراگندگی اور بے مقصدیت کو انتہائی مؤثر اور مخلصانہ انداز میں ملیامیٹ کر کے اُن راستوں پر گامزن کرتے ہیں جو ہر مسلمان کا بالخصوص اور ہر انسان کا بالعموم مقصدِ حیات ہونا چاہیے۔ حضرت مجدد الف ثانی نے اپنے دور کے تمام شعبہ ہائے زندگی میں مثبت تبدیلی لانے کے لئے دیگر کوششوں کے علاوہ اپنے مکتوبات شریف کو بطور ہتھیار استعمال کیا۔ آپ نے اپنے وقت کے امراء، علماء، صوفیاء اور حکومتی عہدیداران کے علاوہ اپنے خلفاء اور مریدین کو اِن خطوط کے ذریعہ غلبۂ اسلام کے لئے مائل کیا۔ سُنت و شریعت کے سانچے میں ڈھل کر ایک باوقار زندگی گزارنے کے لئے تیار کیا اور کفر اور کافرانہ روش کو اپنے ماحول اور دل ودماغ سے دُور کرنے کے لئے بھرپور رہنمائی کی۔ فکر و عمل کی تطہیر کے سلسلہ میں آپ کی جملہ کاوشوں کو درج ذیل عنوانات کے تحت سمجھا جاسکتا ہے۔

1. عہد مجدد میں فکری و عملی بے راہ روی:

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے جس دَور میں آنکھیں کھولیں اُس دَور میں وحدتِ ادیان کا غلغلہ بلند ہو رہا تھا۔ اگر ایک طرف اکبر تمام ادیان کو ملا کر دین الٰہی کا پرچار کر رہا تھا، تو دوسری طرف رامانند، بھگت کبیر، نانک، دادو، دھنہ، نامدیو اور بھگتی تحریک کے دوسرے راہنماؤں کا وحدتِ ادیان بالفاظ دیگر متحدہ قومیت کے تصور کا نعرہ فضا میں گونج رہا تھا۔ ان کی اس تحریک کا نتیجہ لازمی طور پر برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کے ہندوؤں میں جذب ہونے کی صورت میں نکلتا، اور یہ صورتِ حال مسلمانوں کا درد رکھنے والوں کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ مسلمانوں کی اکثریت چونکہ اکبر کو ملحد و زندیق اور بھگتی تحریک کے راہنماؤں کو غیر مسلم سمجھتی تھی۔ جنہوں نے وحدت الوجود تصور توحید کی آڑ میں ملت اسلامیہ کے شیرازہ منتشر کرنے کی ٹھانی تھی اور اِن حالات میں مُسلم صوفیاء کا ایک بڑا گروہ بھی ان سے متأثر نظر آتا تھا۔

حضرت عبد القدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا شمار اس عہد کے غالی وحدت الوجودیوں میں ہوتا تھا اور ان کے ہاں نظریۂ وحدت الوجود ہی کفر و اسلام کا معیار تھا۔ جن دنوں اکبر اور بھگتی تحریک کے رہنما وحدتِ ادیان کا پرچار کر رہے تھے۔ اسی زمانہ میں حضرت عبد القدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے یہ الفاظ بھی فضا میں گونج رہے تھے:

"ایں چہ شور و ایں چہ غوغا کشادہ، کسے مومن، کسے کافر، کسے مطیع، کسے عاصی، کسے درِ راہ، کسے بے راہ، کسے مسلم، کسے پارسا، کسے ملحد، کسے ترسا ہمہ در یک سلک است"[10]۔

ابو الفضل حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے خیالات میں گرہ لگاتے ہوئے لکھتا ہے:

"کدم دین وچہ دینے یک حسن دلآویز در چندیں ہزار پردہ تابش می دہد"[11]۔

ابو الفضل کی گمراہی اور الحاد اظہر من الشمس ہے، لیکن حضرت عبد القدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ جیسے بزرگ جس نظریہ کا پرچار کر رہے تھے، اسے تسلیم کر لینے کے بعد مسلمانوں کا الگ وجود ختم ہو جاتا اور وہ ہندوؤں میں جذب ہو کر رہ جاتے۔

2. اتحادِ امت کیلئے دو قومی نظریہ کی داغ بیل:

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ مسلمانوں کو ایک الگ قوم دیکھنا چاہتے تھے، اور ہر ممکن طریقے سے مسلمانوں کو ہندوؤں میں جذب ہونے سے بچانا چاہتے تھے۔ ایسے خیالات کی تردید کے لیے کمربستہ ہو گئے۔ آپ نے وحدت الوجود کی جگہ مسلمانوں کے سامنے وحدت الشہود کا نظریہ پیش کیا، جسے ماننے سے ان کا جداگانہ وجود باقی رہا۔ اور اس کے ساتھ ہی صدیوں کا جمود اور تعطل ختم ہو کر ان میں عمل و سعی کا ایک نیا جذبہ پیدا ہو گیا۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا اسلامیانِ پاک و ہند پر یہ ایک عظیم احسان ہے کہ انہوں نے وحدتِ ادیان کی تحریک کے علم برداروں اور وحدت الوجودیوں کی سکیم کو ناکام بنا کر برصغیر میں اسلام اور مسلمانوں کو بچالیا۔ حضرت کے اسی کارنامے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبال نے کہا تھا:

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہباں اللہ نے بروقت کیا جس کو خبر دار[12]

3. وحدت الشہود کا پرچار:

وحدت الوجود پر یقین رکھنے سے کفر و اسلام کی تمیز اٹھ جاتی ہے اور اس کا نتیجہ وحدتِ ادیان کی صورت میں نکلتا ہے۔ وحدت الوجود کا نظریہ اپنانے سے جہاں ہر قسم کا تعصب ختم ہو جاتا ہے، وہاں وہ عصبیت بھی ختم ہو جاتی ہے جو ایک دین یا قوم کی انفرادی بقا کے لیے اشد ضروری ہے۔ وحدت الوجود کا عقیدہ جہاں وحدت ادیان کی طرف لے جاتا ہے وہیں وہ متحدہ قومیت کا بھی درس دیتا ہے۔ اس کی بہترین

مثال جمعیت العلمائے ہند کے سیاسی موقف کی ہے۔ جمعیت العلماء کی بنیاد دیوبند کے جن بزرگوں نے رکھی تھی، ان کی اکثریت سلسلہ چشتیہ کی اس صابریہ شاخ سے وابستہ تھی، جس کے سرخیل حضرت عبد القدوس گنگوہی تھے۔ حضرت عبد القدوس گنگوہی وحدت الوجود میں اس قدر غلو رکھتے تھے کہ وہ ایسے امام کی اقتداء میں نماز ادا کرنا جائز نہیں سمجھتے تھے جو وحدت الوجود پر ایمان نہ رکھتا ہو۔ حضرت گنگوہی علیہ الرحمۃ کے صاحبزادے حضرت رکن الدین اپنی مشہور تالیف "لطائف قدوسی" میں رقمطراز ہیں:

"کہ ہمارے والد بزرگوار نے ہمارے پیچھے محض اس وجہ سے نماز پڑھنا ترک کر دی تھی کہ ہم وحدت الوجود پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں وہ فرمایا کرتے تھے کہ تمہارا دین اور ہے اور میرا دین اور"[13]۔

ایک بار حضرت گنگوہی نے اپنی مسجد میں مسئلہ وحدت الوجود پر درس دیا تو حاضرین کی اکثریت نے اس نظریہ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر حضرت گنگوہی نے رنجیدہ ہو کر فرمایا:

"کہ وہ ایسے شہر میں رہنے کے لیے تیار نہیں جہاں کے لوگ وحدت الوجود پر ایمان نہ رکھتے ہوں"[14]۔

اتفاق سے انہی ایام میں ایک روز حضرت گنگوہی کے خلیفۂ اعظم حضرت جلال الدین تھانیسری حضرت کی زیارت کے لیے گنگوہ تشریف لائے۔ جونہی حضرت نے انہیں اپنی طرف آتے دیکھا تو با آواز بلند فرمایا:

"ہماں جاباش و بگوچہ دین داری وچہ مشرب داری"[15]۔

4. رُوحانی فناء وبقاء کا شرعی رنگ:

حضرت تھانیسری کی ذات میں جذب اور فنا کا رنگ تھا اور جذب و فنا کے بعد سالک کی اپنی نمود اور انفرادیت باقی نہیں رہتی۔ حضرت مجدد الف ثانی نے اس خطرے کو بروقت بھانپ لیا تھا اور آپ کو اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ مسلمان وحدت الوجود پر ایمان رکھتے ہوئے برصغیر پاک وہند میں اپنی جداگانہ شخصیت برقرار نہیں رکھ سکیں گے۔ اور وہ ہندوؤں میں جذب ہو کر رہ جائیں گے۔ اقبال نے غالباً اسی وجہ سے نظریۂ وحدت الوجود کو مسلمانوں کے لیے سمِ قاتل کا نام دیا ہے۔[16]

امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی کے بارے میں اسی بنا پر حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا:

"A great religious genius of the seventeeth century Sheikh Ahmed Serhind-whose feareless analytical criticism of contemporary Sufism resulted in the development of a new technique"[17]

خواجہ حسن نظامی کے نام مکتوب محررہ ۳۰ دسمبر ۱۹۱۵ء میں لکھتے ہیں:

"حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی نے مکتوبات میں ایک جگہ بحث کی ہے کہ گسستن اچھا ہے یا پیوستن؟ یعنی فراق اچھا ہے یا وصال؟ میرے نزدیک گسستن عینِ اسلام ہے اور پیوستن رہبانیت یا ایرانی (غیر اسلامی) تصوف ہے اور میں اس غیر اسلامی تصوف کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہوں"۔

یہ حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات کو پڑھنے کا اثر تھا۔ ڈاکٹر علامہ اقبال نے اس کا اعتراف مذکورہ بالا خط میں یوں کیا:

"آپ کو یاد ہو گا جب آپ نے مجھے سر الوصال کا لقب دیا تھا تو میں نے آپ کو لکھا تھا کہ سِرّ الفراق کہا جائے، اس وقت بھی میرے ذہن میں یہی امتیاز تھا کہ جو حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا ہے"[18]۔

اقبال یہ جانتے تھے کہ ذات حق کے ساتھ وصل کی صورت میں ان کی اپنی ہستی مٹ جائے گی۔ لیکن اگر وہ "سر الفراق" بنتے ہیں تو پھر بندہ و مولیٰ میں فرق ہو جاتا ہے، اور اسی صورت میں اقبال کی نمود اور خودی باقی رہ سکتی تھی۔ حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمۃ

نے وحدت الشہود کے نظریہ کا پرچار کر کے مسلمانوں کو ہندوؤں میں جذب ہونے سے بچالیا۔ وحدت الشہود کو مانتے ہوئے سالک کی نمود اور انفرادیت باقی رہتی ہے، اور وہ جذب اور فنا سے بچ جاتا ہے، اور اسے بقائے دوام حاصل ہو جاتی ہے۔ وحدت الوجود کے حامیوں میں آپ کو درجنوں فنا فی اللہ قسم کے سالک ملیں گے لیکن وحدت الشہود میں صرف باقی باللہ ہی نظر آئیں گے۔ وحدت الوجود میں سالک ذات مطلق میں جذب ہو کر فنا ہو جاتا ہے۔ لیکن وحدت الشہود میں وہ فنا فی اللہ نہیں ہوتا۔ اس کا تعلق باللہ رہتا ہے، اس لیے اس کا جداگانہ وجود باقی رہتا ہے۔ اقبال نے جس خودی پر زور دیا ہے وہ چونکہ جذب اور فنا کی صورت میں باقی نہیں رہ سکتی، اس لیے اقبال نے حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمۃ کی طرح نظریہ وحدت الوجود کی مخالفت کر کے مسلمانوں کو ہندوؤں میں جذب ہونے سے بچالیا ہے۔[19]

وحدت الوجود تعطل اور توکل کی تعلیم دیتا ہے، جبکہ وحدت الشہود سعی اور عمل پیہم کا دوسرا نام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ترکوں اور افغانوں میں وحدت الوجود کی تعلیم دینے والے سلسلے کبھی مقبول نہیں ہو سکے۔ یہ چونکہ مارشل قومیں ہیں اس لیے ان کے ہاں نظریہ وحدت الشہود ہی مقبول ہو سکا ہے۔ چونکہ یہی ایک ایسا نظریہ ہے جو حرکت اور عمل کی تعلیم دیتا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمۃ نے برصغیر پاک و ہند میں جس سلسلے کی اشاعت فرمائی تھی وہ سلسلہ چونکہ وحدت الشہود کا قائل اور شریعت کا زبردست حامی تھا، اس لیے برصغیر پاک و ہند کی بگڑی ہوئی فضا میں جہاں غالی وحدت الوجودیوں کی اکثریت تھی، اور لوگ شریعت کا پاس ادب کرنے کے بجائے وحدتِ ادیان کا پرچار کر رہے تھے، سلسلہ مجددیہ زیادہ مقبول نہ ہو سکا۔ حضرت مجدد نے خود ہی اپنے ایک مکتوب والا میں اس بات کا اعتراف فرمایا ہے کہ اس سلسلہ عالیہ کے لوگ اس ملک میں اجنبیوں کی طرح ہیں۔ بدعت کے رواج کی وجہ سے اس ملک کے لوگوں کو اس طریقہ کے بزرگوں سے جو سنت کے سخت پابند ہیں، بہت کم مناسبت ہے۔ حتیٰ کہ قاضی جاوید نے "افکار شاہ ولی اللہ" میں وحدت الوجود کو انسان دوستی اور مختلف اقوام و ملل کے باہمی احترام و تعاون کے فروغ کا ذریعہ قرار دیتے ہوئے وحدت الشہود کو برصغیر میں مسلم سیاسی، ثقافتی اور سماجی زوال کا اہم سبب گردانا ہے جو امتیازات کو اُجاگر کرنے اور تفرقات کا باعث بنتا ہے۔[20]

5. ہندوؤں کی بھگتی تحریک کا سدِباب:

حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمۃ کے زمانہ میں بھگتی تحریک اپنے پورے جوبن پر تھی اور بھگتی تحریک کے راہنماؤں نے اسلام اور کفر میں ہم آہنگی پیدا کر کے ایک درمیانی راستہ تلاش کر لیا تھا۔ وہ عوام کو یہ تأثر دے رہے تھے کہ رام اور رحیم ایک ہی ذات بزرگ کے دو نام ہیں۔ بھگتی تحریک سے وابستہ ایک بھدر پُرش ہردے رام نے حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمۃ کے نام ایک خط میں ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مجدد الف ثانی علیہ الرحمۃ نے اس کے جواب میں جو مکتوب مرغوب تحریر فرمایا، وہ قابلِ توجہ ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

> ''آسمان، زمین اور اعلیٰ و اسفل والوں کا پیدا کرنے والا صرف ایک ہی ہے، اور وہ بے چون و بے چگون ہے، وہ شبیہ اور مانند سے منزہ ہے اور شکل و مثال سے مبرا ہے۔ پدر اور فرزند ہونا اس اللہ تعالیٰ کے حق میں محال ہے۔ اس کی بارگاہ میں ہمسر ہونے کی کسے مجال ہے؟ اللہ تعالیٰ کی شان میں اتحاد اور حلول کی آمیزش کا خیال کرنا اور پوشیدہ ہونے اور ظاہر ہونے کا گمان کرنا برا ہے۔ وہ زمانی نہیں ہے کیونکہ زمانہ اسی کا پیدا کیا ہوا ہے۔ وہ مکانی نہیں ہے کیونکہ مکان اس کا بنایا ہوا ہے۔ اس کے وجود کی کوئی ابتدا نہیں ہے، اور نہ اس اللہ تعالیٰ کی کوئی انتہا ہے۔ سب قسم کا خیر و کمال اس کی ذات میں ثابت ہے اور وہ ہر قسم کے

نقص و زوال سے پاک ہے۔ عبادت کے لیے مستحق اور پرستش کے لائق وہی حق سبحانہ تعالیٰ ہے۔ رام اور کرشن کے پیدا ہونے سے پہلے پروردگار عالم کو کوئی رام یا کرشن نہیں کہتا تھا۔ ہمارے پیغمبر ان علیہم الصلوٰۃ والسّلام نے جو ایک لاکھ چوبیس ہزار کے قریب گزرے ہیں، خلقت کو خالق کی عبادت کرنے کی ترغیب فرمائی ہے۔ اور ان سب نے غیر کی عبادت کرنے سے منع فرمایا ہے۔ اور یہ سب اپنے آپ کو بندہ عاجز جانتے اور خالق عالم کی ہیبت اور عظمت سے ڈرتے اور کانپتے رہتے تھے"[21]۔

اگر حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمۃ کے اس خط کے سیاق و سباق کا بغور مطالعہ کیا جائے تو اس سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے کہ حضرت، وحدت ادیان بالفاظ دیگر متحدہ قومیت کے سخت مخالف تھے، اور وہ مسلمانوں کو ایک الگ قوم دیکھنے کے متمنی تھے۔ مجدد الف ثانی علیہ الرحمۃ چونکہ مسلمانوں کو ہندوؤں میں جذب ہونے سے بچانا چاہتے تھے، اس لیے وہ ان کی ایسی حرکات سے سخت رنجیدہ ہوتے تھے جو ان میں اور ہندوؤں میں مشابہت پیدا کرتی تھیں۔

6. ہندوانہ رسم و رواج کی بیخ کنی:

حضرت کو معلوم ہوا کہ دیوالی کے ایام میں بعض مسلمان عورتیں بھی ہندو عورتوں کی طرح کچے برتنوں پر رنگ پھیرتی اور ان میں سرخ چاول بھرتی ہیں۔ حضرت نے فوراً "بنام یک زن صالحہ"[22] ایک خط میں تحریر فرمایا کہ ایسی باتیں شرک اور کفر ہیں اور ان کا دین اسلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ مزید بر آں آپ فرماتے ہیں کہ رسول خدا نے فرمایا ہے کہ "شرکِ اصغر سے بچو"۔[23] شرک و کفر کی رسموں کی تعظیم کو شرک میں بڑا دخل ہے۔ شرک کی تصدیق اور اظہار کرنے والا بھی مشرک ہے۔ اسلام کی شرط، کفر سے بیزار ہونا ہے، اور شرک سے پاک ہونا توحید کا نشان ہے۔ دکھ، درد اور بیماریوں کے دور کرنے کے لیے بتوں اور شیطانوں سے مدد مانگنا شرک ہے، کافروں کی دیوالی کے دنوں میں کافروں کی رسموں کا بجالانا، خوشی منانا، بیٹیوں اور بہنوں کو ہدیہ بھیجنا اور اپنے برتنوں کو سرخ چاولوں سے بھرنا، یہ سب شرک اور دینِ اسلام کے منافی ہے۔[24]

اسی طرح ایک دوسرے موقع پر حضرت مجدد الف ثانی تحریر فرماتے ہیں:

"کہ بعض جاہل مسلمان ہندوؤں کی دیکھا دیکھی سیتلا (چیچک) کی پرستش کرنے لگے ہیں"[25]۔

حضرت نے انہیں ایسا کرنے سے منع فرمایا کیونکہ یہ کافروں کا شعار تھا۔ اور اگر مسلمان ان شعائر پر عمل کرتے رہتے تو ان کی انفرادیت اور وجود ختم ہو جاتا۔ اس لیے حضرت نے بروقت ان جہلاء کو تنبیہ فرمائی اور ہندوؤں کے شعائر ترک کرنے کا مشورہ دیا۔

ایک دوسرے موقع پر حضرت فرماتے ہیں کہ دیوتاؤں اور بھوتوں سے بیماریوں کے ازالہ میں اہلِ اسلام کے جاہل لوگوں کا مدد طلب کرنا عام ہے۔ اسی طرح ایک دوسرے مکتوب میں موصوف تحریر فرماتے ہیں کہ:

"اپنے انتہائی جہل کی وجہ سے اکثر عورتیں اس حرام و ممنوع استمداد میں مبتلا ہیں اور وہ ان وہمی دیوتاؤں سے بلاؤں کے ٹالنے کی درخواست کرتی ہیں، اور شرک و اہل شرک کی رسموں کو بجالاتی ہیں۔[26] ایک اور موقع پر حضرت تحریر فرماتے ہیں کہ مسلمان باوجود ایمان کے اہلِ کفر کی رسموں کو بجالاتے ہیں اور ان کے ایام کی تعظیم کرتے ہیں۔ ایک اور مکتوب والا میں حضرت تحریر فرماتے ہیں کہ: اہلِ کفر کے بہت سے احکام اور رسوم اہل اسلام میں نمایاں ہو رہے ہیں"[27]۔

ایسی تمام باتیں چونکہ مسلمانوں کو اسلام سے دُور کر کے ہندوؤں سے قریب لا رہی تھیں، اس لیے حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمۃ نے ان باتوں کا بر وقت نوٹس لیا اور مسلمانوں کو ہندوؤں سے دور رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔

7. فکری و عملی پراگندگی کا موثر ازالہ:

ایک بار آپ کو معلوم ہوا کہ عبد الرحیم خان خاناں کے ایک ہم نشین شاعر نے اپنا تخلص کفری رکھ لیا ہے۔ حالانکہ وہ شاعر صحیح النسب سید اور ایک معزز گھرانے کا فرد تھا۔ حضرت نے خان خاناں کو لکھا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اِس تخلص کے اختیار کرنے پر اس کو کس چیز نے آمادہ کیا؟ یہ تخلص نہایت برا ہے، اس لیے ایک مسلمان کو اس سے اس طرح بھاگنا چاہیے جیسے آدمی شیر کو دیکھ کر بھاگتا ہے۔ ایسا تخلص یا نام اللہ اور رسول کے نزدیک قابلِ نفرت ہے، اس لیے ایسے تخلص سے علیحدگی واجب ہے، آپ میری طرف سے اس سے درخواست کریں کہ وہ اپنا تخلص "کفری" کے بجائے "اسلامی"[28] رکھ لے۔ صرف اسی ایک چھوٹی سی بات سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمۃ کتنے باغیرت مسلمان تھے۔ آپ چونکہ مسلمانوں کو ہندوؤں سے ایک الگ قوم دیکھنا چاہتے تھے اس لیے انہیں اتنی سی بات بھی گوارا نہ تھی کہ مسلمان غیر اسلامی تخلص اختیار کریں۔

8. اسلامی غیرت و حمیت کو بیدار کرنا:

حضرت مجدد الف ثانی نے مسلمانوں کی غیرت کو للکارا اور غیر مسلموں کے عقائد و افکار اپنانے پر ان کی سرزنش کی۔ آپ نے انہیں بتایا کہ اگر وہ اس ملک میں بہ حیثیت ایک قوم زندہ رہنا چاہتے ہیں تو پھر انہیں کفر و شرک ترک کر کے کافروں سے ممیز ہو کر رہنا ہو گا۔ ہم حضرت مجدد کے متعلق یہ بات دعویٰ سے کہہ سکتے ہیں کہ آپ ہی نے قیام پاکستان کا تصور پیش کیا تھا اور آپ ہی صحیح معنوں میں پہلے پاکستانی تھے۔

9. صوفیانہ اصطلاحات میں تعلیماتِ اسلامی کی ترویج:

امامِ ربانی حضرت مجدد الف ثانی نے اپنے مکتوبات اور دیگر کتب کے ذریعے تصوف کو یونانی اور ہندوانہ تصوف سے پاک کیا جس کو سمجھنے کے لئے چند اصطلاحات تصوف کا انتخاب کیا گیا ہے۔

1. تزکیۂ نفس:

ضابطۂ شریعت کے چوتھے رکن تزکیۂ نفس کو استحسانی رکن کہتے ہیں۔ "تزکیۂ نفس" یا تصفیۂ نفس کہتے ہیں نفسِ امّارہ کو برائیوں، بے جا خواہشوں یا روحانی بیماریوں سے پاک و صاف کرنے کو۔ اور یہی سیر و سلوک کا مقصود ہے۔ حضرت امام ربانی میاں حاجی محمد لاہوری کو تحریر فرماتے ہیں کہ:

> "سیر و سلوک کا مقصد یہی ہے کہ نفس امّارہ برائیوں سے اور عیبوں سے پاک ہو جائے تاکہ انسان کو جھوٹے معبودوں کی پرستش سے نجات مل جائے اور معبودِ برحق کے سوا کوئی اور ہستی اس کی توجہ کا مرکز نہ رہے"[29]۔

2. قلب:

اس نفسِ امّارہ کی آماجگاہ قلب ہے۔ اس لیے روحانی بیماریوں کا منبع بھی قلب ہی ہوا۔ حضرت امام ربانی فرماتے ہیں کہ آپ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی ہے کہ قلب دو مساوی حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے نصف کا تعلق عالمِ خلق سے ہے، دوسرے کا عالمِ امر سے ہے۔ اس طرح قلب روحانی و مادی دونوں قوتوں کا سرچشمہ ہوا۔ خلق سے تعلق رکھنے والے اس قلب کا نصف ہوا و ہوس کی قوتوں کا

مرکز ہے۔ خواہشات نفسانی کے مرکز اس چوتھائی قلب کو ہی ہم دل یا قلب کہہ کر پکارتے ہیں، اسی لیے کہا جاتا ہے کہ قلب "عالمِ خلق" اور "عالمِ امر" کے درمیان برزخ کی حیثیت رکھتا ہے۔ حضرت امام ربانی قلب کے نفسانی مرکز کی یوں تعریف فرماتے ہیں:

"پس ربعِ عبارت از مقامِ ہوا باشد کہ قلب متضمن آنست"[30]

"پس چوتھائی قلب ہوا وہوس کی آماجگاہ ہے اور اسی کو قلب کے نام سے تعبیر کیا کرتے ہیں"۔

3. نفسِ امّارہ:

یہ نفسِ امّارہ ہماری ساری مصیبتوں اور بیماریوں کی جڑ ہے۔ یہ ہمارا سب سے قریبی مصاحب مگر بہت ہی برا مصاحب اور جانی دشمن ہے۔ اس کی سب سے بڑی تمنا اللہ تعالیٰ کی حکم عدولی اور اس کی سب سے بڑی آرزو شیطان کی اطاعت ہے۔[31] حضرت شیخ فرید کو تحریر فرماتے ہیں کہ:

"نفسِ امّارہ چاہتا ہے کہ سائر خلائق اس کی محتاج رہے اور اوامر و نواہی اسی کے اشارے پر سرزد ہوں وہ کسی کا محتاج نہیں بننا چاہتا۔ اسی کو دعویٰ الوہیت اور خدائے بے ہمتا جل سلطانہ کی قدرت میں شرکت کہتے ہیں۔ مگر یہ منحوس صرف اسی پر راضی نہیں۔ اس کی مرضی تو یہ ہے کہ وہ حاکم مطلق بلا شرکت غیرے بن جائے اور سب اسی کے اشارے پر ناچتے رہیں، اس لیے حدیث قدسی میں آیا ہے کہ عاد نفسک فانہا انتصبت بمعاداتی، اپنے نفس کو اپنا دشمن سمجھو، کیونکہ اس کی دوستی میری دشمنی پر ور غلاتی ہے"[32]۔

4. امراضِ قلبی:

ہوائے نفسانی، زن، زر، زمین سے لگاؤ، اموال و اولاد سے محبت، جاہ و ریاست اور نام و نمود کی طلب قلبی و روحانی بیماریوں کے مختلف روپ ہیں۔ یہ سب کچھ ہم اپنے نفسِ امّارہ کی خاطر چاہتے ہیں اس لیے ہمارا معبود خود ہمارا نفس ہوا، جس کی غلامی سے نجات پر اُخروی نجات و فلاح منحصر ہے۔ حضرت امام ربانی ارشاد فرماتے ہیں کہ:

"پس فی الحقیقت معبود و نفسِ اوست، تازمانے از گرفتاری او اخلاص نشود، امید نجات بسے مستبعد است"[33]

"پس حقیقتاً اس کا معبود اسی کا نفس ہے جب تک اس کی قید سے رہائی نہیں ملتی، نجات کی امید رکھنا انتہائی دُور کی بات ہے"۔

اسی لیے صاحب عرفان عالموں اور بابصیرت مفکروں اور دانشوروں پر فرض ہے کہ وہ قلبی و روحانی امراض سے چھٹکارا حاصل کرنے کی تدابیر اختیار کریں۔

"پس بر علمائے اولو الالباب و حکمائے ذوی الابصار فکر ازالۂ ایں مرض لازم است، در خانہ اگر کسے است، یک حرف بس است"[34]

یعنی: علمائے اولو الباب و حکمائے ذوی الابصار پر اس مرض سے چھٹکارا حاصل کرنے کا فرض عائد ہوتا ہے اگر گھر میں ذرا سی بھی گنجائش موجود ہے تو بس یہی ایک حرف کافی ہے۔

5. ازالۂ امراضِ قلبی کی ضرورت:

ان امراض قلبی اور باطنی آفات سے نجات اس لیے ضروری ہے کہ ان کی وجہ سے ہمارا ایمان متزلزل ہو جاتا ہے۔ حضرت امام ربانی فرماتے ہیں کہ:

"جس طرح اعضائے جسمانی کے ضعف سے احکامِ شریعت کی بجا آوری میں تامل و تکلّف محسوس ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح ضعفِ ایمانی سے بھی ان کی تعمیل میں تامل و تکلّف پیدا ہو جاتا ہے"[35]۔

آپ تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ نفسِ امّارہ کی غلامی اور امراض قلبی میں گھرے ہونے کی وجہ سے تلاوتِ قرآنی سے بجائے فائدے کے الٹا نقصان ہوتا ہے۔ آپ حکیم عبد القادر کو تحریر فرماتے ہیں کہ:

"تازمانے کہ در مرض قلبی مبتلا است "فی قلوبھم مرض" ہیچ عبادتے وطاعتے و انافع نیست بلکہ مضر است حدیث معروف است، رُبّاصائم لیس لہ من صیامہ الا الجوع والظماُ (خبر صحیح)"[36]

"جب تک مرض قلبی میں مبتلا رہو گے، قرآن شریف کی نص کے مطابق جن کے دل بیمار ہیں ان کے لیے کوئی عبادت و اطاعت مفید نہیں بلکہ مضر ہے)۔ یہ مشہور حدیث "خبر صحیح" ہے کہ اکثر روزے دار کو اس کے روزے سے بھوک پیاس کے علاوہ کچھ بھی نہیں ملتا"

آپ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

"جس طرح صفراوی امراض کی وجہ سے قند و نبات کی مٹھاس محسوس نہیں ہوتی بالکل اسی طرح امراضِ قلبی کی وجہ سے ایمان کی خوشبو کا احساس باقی نہیں رہتا۔ کیونکہ ہمارا ضمیر مردہ ہو جاتا ہے اس لیے ان سے نفس کی صفائی و پاکیزگی ضروری ہے۔ اور جسے تزکیۂ نفس کی سعادت مل گئی اسے فلاحِ دارین نصیب ہو گئی"[37]۔

"قد افلح من زکّٰھا و قد خاب من دسھا"

" اسی کو فلاح ملی جس کا نفس پاکیزہ ہو گیا اور محرومی اس کا مقدر بن گئی جس نے اسے اپنے میں چھپا لیا"

اسی تزکیۂ نفس کے بعد قلبی اطمینان حاصل ہوتا ہے اور اسی سے اللہ تعالیٰ کی دوستی و قربت حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ اسی کی بدولت ایمان کی سعادت اور ایمان و وجدان کی دولت عظمٰی ملتی ہے۔ حضرت امام ربانی فرماتے ہیں کہ:

"پس بعد از تزکیۂ نفس و اطمینان آں حقیقت ایمان صورت دارد و وجدان می گردد و ایں قسم ایمان از زوال محفوظ است۔ آیت کریمہ الا ان اولیآء اللّٰہ لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون، در شان ایشاں صادق است"[38]۔

"پس تزکیۂ نفس اور روحانی اطمینان کے بعد ایمان کی حقیقت اپنی صورت اختیار کرتی ہے اور ایمان وجدان میں تبدیل ہو کر زوال سے محفوظ ہو جاتا ہے، اس لیے آیت کریمہ میں اولیاء اللہ کو بشارت دی گئی ہے کہ ہاں! یہی تو اللہ تعالیٰ کے اولیاء، اس کے محبوب و برگزیدہ بندے ہیں جو خوف و دہشت اور حزن و ملال سے بالاتر ہو کر رضائے الٰہی کے مطابق زندگی گزارتے ہیں"۔

6. طبعی و فطری خواہشات:

تقاضائے بشریت کو دبانے یا کچلنے کو تزکیۂ نفس نہیں کہتے۔ اس کے برخلاف جو خواہشات منشائے طبیعت کے عین مطابق ہیں، انہیں پورا کرنا عین منشائے الٰہی ہے۔ مثلاً بھوک لگے تو کھانا کھانا، پیاس لگے تو پانی پینا، طہارت کی غرض سے یا شدید گرمی میں غسل کرنا اور جاڑوں میں سردی سے بچنے کے لیے موٹے ملبوسات پہننا، یہ سب فطری ضروریات میں شامل ہیں۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم خود شیرینی پسند فرماتے تھے۔ پس فطری خواہشات کی تکمیل عبادات و عبودیت کے منافی نہیں ہے۔ حضرت امام ربانی فرماتے ہیں کہ:

1. "نفسِ امّارہ کی خواہشات طبعی ضروریات کے زمرے میں نہیں آتیں۔ نفسِ امّارہ کی خواہشات مباحات فضولیہ ہیں یا مشتبہات یا

حرام اشیاء کی طلب۔ پس ان تینوں قسموں کی خواہشات کو دل سے نکال دینا چاہیے"۔[39]

2. "نفسِ امّارہ کے ایما پر جو فساد پیدا ہوتا ہے، اسے مرض ذاتی کہتے ہیں۔ یہی مرض ذاتی سَم قاتل ہے اور منافی عبودیت۔ پس اس سے پوری طرح اجتناب برتنا چاہیے"۔[40]

7. مخالفتِ نفس کی ناگزیریت:

تزکیۂ نفس کا مقصود یہ نہیں کہ نفسِ امّارہ یکسر اپنی خصوصیات سے اس حد تک محروم ہو کر رہ جائے کہ پھر اس میں مخالفت یا مقابلے کی سکت ہی باقی نہ رہے۔ اس کے بر خلاف روحانی و باطنی ترقی اسی مخالفت نفس پر مبنی ہے۔ اسی بناء پر مخالفت نفس کو جہادِ اکبر کہتے ہیں۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم جہاد سے فارغ ہو کر فرمایا کرتے تھے کہ:

"رجعنا من الجهاد الاصغر الى الجهاد الاكبر"

"اب ہم جہاد اصغر (جہاد بالسیف) سے جہاد اکبر (جہاد نفس) کی طرف رجوع ہو رہے ہیں"[41]۔

8. نفسِ مطمئنہ کا مقام:

"نفسِ امّارہ کی مخالفت کے باوجود سنت نبویہ کے مطابق احکامِ شریعت کی تعمیل کرتے کرتے ایک وقت ایسا آتا ہے کہ یہی نفسِ امّارہ نفسِ مطمئنہ میں تبدیل ہو کر روحانی ترقیوں کا اہل بن جاتا ہے۔ پھر مومن کی نماز صورت نماز نہیں رہتی، بلکہ حقیقت نماز بن جاتی ہے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اسے اتباعِ رسالت کی حقیقت حاصل ہو جاتی ہے"[42]۔

9. سلامتی قلب (سیاستِ قلب) کا درجہ:

نفسِ امّارہ "سیاستِ قلب" کی بدولت نفسِ مطمئنہ کی ہیئت اختیار کر لیتا ہے۔ حق سبحانہ و تعالیٰ کے علاوہ دیگر معبودوں کی غلامی سے نجات حاصل کر کے نفسانی سرگرمیوں سے پیچھا چھڑانے کا نام سیاستِ قلب ہے اور اسی کو "سلامتیِ قلب" بھی کہتے ہیں۔ حضرت امام ربانی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ:

"وعلامت سلامتی از گرفتاری "نسیان ماسوائے اوست" (تعالیٰ و تقدس) و تا سرِ مو از غیر آگاہ است از سلامتی گمراہ است۔ مطوبیٰ لم سلّم لِربہ" [43]

"نفسِ امّارہ کی غلامی سے رہائی یا سلامتی قلب کی علامت یہ ہے کہ حق تعالیٰ و تقدس کے ماسوا ہر شے کو یکسر فراموش کر دیا جائے اور جب تک بال برابر غیر حق کا احساس باقی رہے راہ سلامتی سے گمراہ ہو کر ادھر اُدھر بھٹکتا ہی رہے گا۔ پس فلاح و نجات کی خوشخبری صرف اسی کے لیے مخصوص ہے جس نے اپنے قلب کو اپنے رب کے لیے مخصوص کر کے "سلامتی" کی نعمت و برکت حاصل کر لی"۔

10. فقرِ محمدی اور صوفی:

نفسانی خواہشات سے بے نیاز ہو جانے کو فقر محمدی کہتے ہیں۔ حضرت امام ربانی قدس اللہ سرہ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

"و فقر فقر محمد گشت علیہ و علیٰ الہ الصلوات والتسلیمات زیرا کہ در فقر نامرادی نفس است و حصول عجز آں مقصود از بعثت انبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات"[44]

"اور اسی فقر کو فقر محمدی علیہ و علیٰ آلہ الصلوات والتسلیمات کہتے ہیں کیونکہ "فقر" نامرادیِ نفس کا دوسرا نام ہے اور نفسِ امّارہ کی عاجزی و بے بسی بعثت انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کا مقصود ہے"۔

اسی طرح کمال اتباع نبوت اور تعمیل احکام شریعت سے "فقر محمدی" کی دولت مل جاتی ہے اور نفسِ امّارہ نفسِ مطمئنہ کی ہیئت اختیار کر کے ہوائے نفسانی سے پاک و صاف ہو کر فلاحِ سرمدی کی نعمتوں سے مؤمن کو مالامال کر دیتا ہے۔

11. محبت ذاتی:

پھر یہی نفسِ مطمئنہ فقر محمدی کی برکتوں سے "محبت ذاتی" کی تجلیات کا سرچشمہ بن جاتا ہے۔ دل نفسانی مرادات سے پاک ہو جائے تو پھر حق تعالیٰ کی محبت بندے کے دل میں سما جاتی ہے۔ اسی کو محبت ذاتی کہتے ہیں۔ حضرت امام ربانی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ:

"محبت ذاتی اللہ سے اللہ ہی کے لیے کرنے کو کہتے ہیں یا اللہ سے اللہ ہی کی طلب کا نام محبت ذاتی ہے"[45]۔

گویا تنعمات دنیوی سے بے نیاز ہو کر رضائے الٰہی کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے کا نام محبت ذاتی ہے۔ اور اس سے بڑھ کر کونسا عیش ہو سکتا ہے کہ بندے کے کردار سے اس کا مولا راضی ہو جائے اور اس سے سنگین کونسی جفا ہے کہ اس کے اعمال سے اس کا خدا ناراض رہے۔ اسی لیے حضرت امام ربانی رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

"رضاء اللّٰہ تعالٰی فی الجنۃ خیر من الجنۃ و سخط اللّٰہ تعالٰی فی النار شر من النار"[46]

"جنت میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی جنت سے بہتر ہے اور جہنم میں اللہ تعالیٰ کا خشم و عتاب جہنم سے بدتر ہے"۔

اس لیے اس محبت کی ذاتی نعمتوں سے اور برکتوں سے مالامال ہونے کے بعد مؤمن کے دل سے جو آواز نکلتی ہے تو بس یہی کہ:

"خدایا! جو تیری مرضی وہی میری مرضی، اور جو تیری مراد وہی میری مراد، میں تو وہی چاہتا ہوں جو تو چاہتا ہے"[47]۔

12. فنائے مطلق کا حصول:

گویا محبت ذاتی کی نعمتیں اور برکتیں اپنی مرضی کو اللہ تعالیٰ کی مرضی میں فنا کر دینے سے میسر ہوتی ہیں۔ حضرت امام ربانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

"اس منزل پر فائز ہونے کے بعد مؤمن کی نظر میں دنیوی کلفتیں اور راحتیں دونوں یکساں ہو جاتی ہیں۔ "ہر چہ از دوست می آید نیکوست"۔ جو بھی دوست عطا فرما دے سر آنکھوں پر، وہی نعمتِ غیر مترقبہ ہے، اس عالم میں وہ اپنے رب کی عبادت اپنے نفس کے لیے نہیں کرتا۔ کیونکہ نعمت و کلفت دونوں کیفیتیں اس کی نظر میں ایک جیسی ہو جاتی ہیں"[48]۔

اسی کیفیت اور اسی عالم کو فنائے مطلق کہتے ہیں اور یہ محبت ذاتی کا ثمرہ ہے۔ حضرت امام ربانی مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

ذاتِ حق در ذاتِ صوفی گم شود   ایں سخن گے باورِ مردم شود[49]

13. اولیائے مقربین اور دولتِ اخلاص:

اخلاص کی دولت عظمیٰ جسے مل گئی وہ اللہ تعالیٰ کا محبوب بندہ ہو گیا۔ اسی لیے ایسی بزرگ ہستیوں کو اولیائے مقربین کہتے ہیں۔ حضرت امام ربانی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ:

اولیائے مقربین کی توجہ کا مرکز فقط معبودِ حقیقی کی ذات ہی ہوتی ہے وہ دینی و دنیوی مقاصد میں سے کسی کو اپنا معبود نہیں سمجھتا کیونکہ اللہ کی ذات کے سوا کوئی اور شے اس کی مقصود نہیں ہوتی۔[50]

ابرار اور مقربین کے درجات میں تفاوت:

ابرار کا مرتبہ اولیائے مقربین سے کمتر ہوتا ہے۔ حضرت امام ربانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

"ابرار کا مرتبہ اولیائے مقربین سے کم ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ محبت ذاتی کی دولت سے محروم ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت جنت کی طمع کی بناپر کرتے ہیں"[51]۔

تزکیۂ نفس اور اخلاص کے ذرائع:

تزکیۂ نفس اور اخلاص کی دولت ضابطۂ شریعت کی اتباعِ کامل سے ملتی ہے۔ اعمالِ صالحہ اور احکامِ شرعیہ کی بجا آوری کے بعد جو بھی وقت بچے اسے ذکرِ الٰہی کے لیے وقف کر دینا چاہیے۔ حضرت امام ربانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

"پس لازم ہے کہ اہلِ سنت کے مطابق اپنے عقائد درست کریں اور احکام شرعیہ کی بجا آوری کے بعد ذکر الٰہی سے اپنے باطن کو منور رکھیں کہ فلاح اخروی کثرتِ ذکر پر موقوف ہے۔ ارشادِ ایزدی ہے کہ "**واذکروا اللہ کثیرا لعلکم تفلحون**"" اور اللہ کا ذکر کثرت سے کیا کرو کہ اس کی بدولت تمہیں فلاح مل جائے گی"۔ پس جو بھی تمہیں اس ذکر سے باز رکھے اسے اپنا دشمن جانو۔ نجات کی یہی صورت ہے۔ اللہ تعالیٰ اسی لیے فرماتا ہے:

"**الا بذکر اللہ تطمئن القلوب**" "یہ سمجھ لو کہ اللہ کے ذکر ہی سے قلبی اطمینان حاصل ہوتا ہے"[52]۔

ذکرِ الٰہی کے ساتھ ساتھ انتہائی الحاح وزاری اور عجز و نیاز سے توبہ و استغفار اور اظہارِ ندامت سے بھی اخلاص کی دولت حاصل ہونے میں مدد ملتی ہے۔

احتسابِ نفس کے وظائف:

احتسابِ نفس سے مراد یہ ہے کہ بندہ رات کو سونے سے پہلے اپنے خیالات، اقوال، افعال بلکہ تمام حرکات و سکنات کا جائزہ لینے کے بعد اپنی کوتاہیوں پر اظہارِ ندامت کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں گڑگڑا کر توبہ و استغفار کے ساتھ معافی کا طلبگار ہو۔ حضرت امام ربانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

"فقیر کی رائے میں سونے سے قبل سو مرتبہ تسبیح تحمید و تکبیر (سبحان اللہ، الحمدللہ، اللہ اکبر) وردِ زبان رکھنا محاسبہ کا مناسب ترین طریقہ ہے اور یہی آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم سے ثابت ہے۔ کلمہ تسبیح توبہ کی کلید ہے۔ اس کے ورد سے بندہ اپنی کوتاہیوں پر معافی طلب کرتا اور بارگاہِ ایزدی کو ان تمام باتوں سے پاک قرار دیتا ہے جن کی بناء پر اس نے برائیوں کا ارتکاب کیا ہے"[53]۔

اسی مکتوب کے مطابق صاحب فتوحات مکیہ شیخ اکبر حضرت محی الدین ابن عربی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ:

"میں اپنے ہم عصر مشائخ رحمۃ اللہ علیہم کے مقابلے میں انتہائی اہتمام سے بڑے شد و مد سے اپنے نفس کا محاسبہ کرتا ہوں حتیٰ کہ میں نے اپنے قلبی خطرات اور نیات کا بھی محاسبہ کیا ہے"۔

بلاشبہ خطرات و نیات کا محاسبہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ پھر اسی مکتوب کے آخر میں حضرت امام ربانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

1. استغفار میں گناہوں کی ستر پوشی کی طلب پائی جاتی ہے اور کلمۂ تنزیہ سبحان اللہ کے ذریعہ بندہ اپنے گناہوں کے دُھل جانے کی طلب کرتا ہے۔

2. الحمدللہ کی تکرار سے بندہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں پر اظہارِ شکر کرتا ہے۔
3. اللہ اکبر کے ورد سے بندہ اقرار کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ اسی قدر بلند ہے کہ اس کے شایانِ شان نہ تو اظہارِ معذرت کر سکتا ہے اور نہ ہی اظہارِ شکر۔ یہ آیہ کریمہ اسی بات کو واضح کرتی ہے کہ سبحان ربک رب العزۃ عما یصفون۔ آپ کا رب، صاحبِ عزت رب ہر چیز سے حتیٰ کہ اپنے بندے کی توصیف سے بھی بالاتر اور بے نیاز ہے۔

فلسفۂ خودی اور سالکِ طریقت:

ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی — یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے (اقبال)[54]

جیسا کہ ذکر کیا جاچکا ہے کہ نفس کی غلامی ہی ساری برائیوں کی جڑ ہے، اس لیے اپنے نفس کی غلامی سے نجات کا مطلب یہ ہے کہ غیر حق یا ماسوائے حق کی غلامی سے نجات مل گئی۔ اپنے نفس کی غلامی ہی کو خود پرستی کہتے ہیں اور بت پرستی بھی خود پرستی کا ایک روپ ہے۔ یہ ہمارا نفس ہی ہے جو سنگی ٹکڑوں کو تراش خراش کر بتوں کو گھڑ لیتا ہے۔ اس لیے نفس پرستی خود پرستی حتیٰ کہ نفس کے ایماء پر ہر قسم کے مادی تصوراتی بتوں کی پرستش سے بے نیاز ہو کر تزکیۂ نفس، محبت ذاتی، فنائے مطلق اور اخلاص کی دولت عظمیٰ مل سکتی ہے۔

حضرت امام ربانی قدس اللہ سرہ میاں مزمل کو تحریر فرماتے ہیں کہ:

"ہر بلائے کہ ہست از گرفتاری خود دست۔ چوں از خود نفس خلاص شد از گرفتاری مادون او سبحانہ، خلاص شد"

"اگر بُت می پرستد فی الحقیقت خود را می پرستد کہ افرأیت من اتخذ الھہ ھواہ"[55]

"خود اپنے نفس کی غلامی ہی ساری بلاؤں کی جڑ ہے جوں ہی خود اپنے نفس کی غلامی سے نجات مل گئی اسی لمحے "ماسوائے حق" سبحانہ کی غلامی سے نجات مل جاتی ہے۔ اگر بتوں کی پرستش کرتا ہے تو پھر دراصل خود اپنے نفس کی پرستش کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: آیا آپ نے اس شخص کی کیفیت کا مشاہدہ نہیں فرمایا جس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنالیا ہے، یعنی بندۂ ہوا و ہوس بن گیا ہے"۔

خودگزاشتی یا خودباختگی:

اس لیے فلاحِ سرمدی حاصل کرنے کے لیے اپنے نفس کا ساتھ چھوڑنا، اپنے نفس کی بندگی اور پیروی سے منہ موڑنا ضروری ہے۔ اپنے نفس کی حمایت ترک کرنے اور اس کی بندگی سے اظہارِ بریت وبیزاری کے بعد ہی بندہ اپنے نفس، اپنی انا کے خول سے باہر آجاتا ہے۔ اسی کو خودگزاشتی یا خودباختگی کہتے ہیں اور یہی حقیقی مسرت وشادمانی کا سرچشمہ ہے۔ حضرت امام ربانی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ:

"از خودگزاشتی ہمہ عیش است وخوشی۔ دع نفسک وتعال"[56]

"خودگزاشتی، خودباختگی اپنی انا کے خول سے باہر نکلنے سے ہی حقیقی عیش اور حقیقی خوشی مل سکتی ہے، اسی لیے کہا گیا ہے کہ اپنے نفس سے منہ موڑ کر ہمارے قریب آجاؤ، یعنی قربت ایزدی کی برکتوں سے فیضیاب ہو جاؤ"۔

خودشناسی، معرفت باطنی:

جس طرح خودگزاشتی قربت الٰہی کے لیے ضروری ہے، اسی طرح خودشناسی بھی لازمی ولابدی ہے۔ اپنے باطن کو ٹٹولنے، اپنے اندر جھانکنے اور خود اپنی معرفت حاصل کرنے سے قربتِ الٰہی نصیب ہوتی ہے۔ اس حقیقت کو حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے "در خود رفتن" یا اپنے باطن کی سیر کرتے ہوئے اس کی گہرائیوں تک پہنچنے سے تعبیر کیا ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تو خود ہمارے باطن میں چھپا ہوا ہے، پھر اِدھر اُدھر بھٹکنے کی ضرورت کیا ہے؟ اسی مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

"ہم چنانکہ از خود گزاشتن فرض است، در خود رفتن ہم لازم است کہ یافت اینجاست، در بیرونِ خود یافت نمی باشد"

باتو در زیرِ گلیم است ہر چہ ہست ہم چو نابینا مبر ہر سوئے دست[57]

"جس طرح خود اپنے نفس سے منہ موڑنا فرض ہے، خود اپنے باطن کی سیر بھی لازمی ہے کہ حق تعالیٰ تو خود ہمارے باطن میں موجود ہے۔ اس لیے خود اپنے باطن کے باہر اُسے نہیں پاسکتے"۔

سیر آفاقی اور صوفی باصفا:

تُو پھر اپنی نفسانی خواہشات کی خاطر اپنے نفس کی غلامی کا طوق اپنے گلے میں ڈال رہا ہے۔ یہ نفس کی غلامی تو تجھے اس کائنات (آفاق) کی در بدر خاک چھاننے اور راہِ حق "صراطِ مستقیم" سے اِدھر اُدھر بھٹکنے ہی میں منہمک رکھے گی۔ حضرت امام ربانی قدس اللہ سرہ نے نفسِ امّارہ کی غلامی و بندگی میں راہِ حق سے بھٹک کر مارے مارے پھرنے کو "سیر آفاقی" سے تعبیر کیا ہے۔ بندہ اس "سیر آفاقی" میں اس وقت تک بھٹکتا رہے گا جب تک وہ ماسوائے حق ہر قسم کے "معبودانِ آفاقی" کی غلامی و بندگی سے رہائی حاصل نہیں کر لیتا۔ اس لیے خود اپنے نفس کی بندگی سے منہ موڑ کر ہی قربتِ الٰہی مل سکتی ہے۔

سیر انفسی کے مقامات:

حضرت امام ربانی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ "سیر آفاقی" سے نجات حاصل کرنا ہے تو اپنے باطن، خود اپنے اندر کو کھنگال ڈالو۔ اپنے باطن کی گہرائیوں تک پہنچنے کے لیے خود اپنے باطن ی سیر کرنا ضروری ہے۔ اسی کو آپ نے سیر انفسی سے تعبیر کیا ہے۔ اسی سے معرفت باطن کی سیر کرنے کی سعادت ہر ایک کو نہیں ملتی۔ صرف ان بزرگ ہستیوں کو نصیب ہوتی ہے جو محبت ذاتی اور فنائے مطلق کی دولتِ عظمیٰ حاصل کر کے اخلاص کے بلند ترین مقام پر فائز ہو جاتی ہیں۔ حضرت امام ربانی قدس اللہ سرہ اسی لیے فرماتے ہیں کہ:

"سیر آفاقی بُعد در بُعد است و سیر انفسی قرب در قرب۔ اگر شہود است در خود است۔ اگر معرفت است ہم در خود۔ اگر حیرت است ہم در خود بیرونِ خود قدم گاہے نیست"[58]

"سیر آفاقی" اپنے نفس کے اشاروں پر، اپنی انا کے جال میں پھنس کر کائنات کے گوشے گوشے میں اِدھر اُدھر بھٹکنے اور دربدر کی خاک چھاننے سے راہِ حق سے دور بہت ہی دور ہوتے جائیں گے تو پھر مقصود سے محرومی ہمارا مقدر بنتی جائے گی۔ اور "سیر انفسی" سیر باطنی یا خود اپنے اندر، اپنے دل میں، اپنے من میں جھانکتے ہی، دل کی آنکھوں سے روح کی گہرائیوں میں دیکھتے ہی حق سے قریب اور قریب ہونے کی سعادت نصیب ہو سکتی ہے۔ شہود کی تجلیوں سے دیدۂ بینا کو ٹھنڈک مل سکتی ہے تو پھر اسی عالم ہی میں۔ ہاں محبوبِ بر حق کا دیدار ہو سکتا ہے تو یہیں اپنے من میں۔ اس کی معرفت مل سکتی ہے تو یہیں دل کی گہرائیوں میں ڈوب ڈوب کر"۔

دیدار و معرفت کی سعادت مل گئی تو پھر اَنا کے عنکبوتی تارے انوار و تجلیات کی بارش سے ایک ایک کر کے ٹوٹتے جائیں گے اور دوئی کے حجابات آنِ واحد میں تار تار ہو کر ہوا ہو جائیں گے۔ اسی عالم میں ایسے ایسے سربستہ اسرار ایک ایک کر کے پلک جھپکتے ہی یوں منکشف ہوں گے کہ ہم ورطۂ حیرت میں، مارے حیرت کے مدہوش ہو کر رہ جائیں گے اور پھر اُسی کی بارگاہ میں، اسی کی لامتناہی

قدرت و قادریت یوں ہمارے ہوش و حواس پر چھا جائے گی کہ بصد عجز و نیاز اپنی بندگی کا وِرد دھڑکنوں کے ساز سے ہم آہنگ ہو کر سراپا زبان بن جائے گا۔

یہ سعادت اپنے سے باہر آفاق و کائنات میں یوں ہی مارے مارے پھرنے سے کہاں میسر ہو سکتی ہے! منزل تو دُور کی بات ہے، راہِ حق کی کسی ایک قدم گاہ کا کوئی نشان بھی ڈھونڈنے سے نہیں پا سکتے۔ حکیم الامت علامہ اقبال فرماتے ہیں:

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق (علامہ اقبال)[59]

لہٰذا مذکورہ بالا تفصیلات و توضیحات سے یہ امر واضح اور روزِ روشن کی طرح عیاں ہوتا ہے کہ تطہیر فکر و عمل کے لئے مکتوبات امام ربانی ایک نادر تریاق ہے جو تیر بہ ہدف ہے اور آپ نے ان کی مدد سے اپنے دور کے علماء، صوفیاء، امراء، حکامِ بالا اور عوام الناس کو مخاطب فرما کر تطہیر فکر و عمل کا کام کیا۔ پھر آپ کی اسی سعی جمیلہ سے ہندوستانی تاریخ کا نقشہ بدل گیا۔ شاہجہان اور اورنگ زیب جیسے نابغہ روزمرد و حید پیدا ہوئے اور حضرت مجدد الف ثانی نے "سرمایہ ملت کا نگہبان" کی حیثیت سے اپنا فریضہ خوب نبھایا۔

حواشی و حوالہ جات:

[1] احمد سرہندی، شیخ: مکتوبات امام ربانی (سہ مجلدات) مطبوعہ امرتسر ۱۳۳۳ھ۔

[2] سرہندی، بدرالدین، حضرات القدس، جلد: ۲، ص: ۱۱۳-۱۴۳۔

[3] لاہوری، باقر، محمد، کنز الہدایات مرتبہ: مولانا نور احمد امرتسری۔

[4] صفر احمد، مقاماتِ معصومی، ص: ۴۶۷۔

[5] قندہاری، فضل اللہ، محمد، عمدۃ المقامات، لاہور، ۱۳۵۵ھ۔

[6] مستقیم زادہ، تحفۃ الخطاطین، (مقدمہ)۔

[7] مجددی، سعید احمد، محمد، البیان شرحِ مکتوبات، مطبوعہ تنظیم الاسلام پبلی کیشنز، گوجرانوالہ، ۲۰۰۲ء۔

[8] مجددی، محمد اقبال، پروفیسر، مقدمہ البینات شرح مکتوبات، مطبوعہ گوجرانوالہ، ۲۰۰۲ء۔

[9] امین اللہ وثیر، ڈاکٹر، بحوالہ جہانِ امام ربانی، اقلیم پنجم، امام ربانی فاؤنڈیشن، کراچی، اشاعت ۲۰۰۵ء، ص: ۲۳۴۔

[10] مسعود احمد، پروفیسر، ڈاکٹر، جہانِ امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی، (حضرت مجدد الف ثانی اور دو قومی نظریہ) از: پروفیسر محمد اسلم، امام ربانی فاؤنڈیشن، ۲۰۰۵، کراچی، اقلیم جلد چہارم، ص: ۱۸۵۔

[11] مسعود احمد، پروفیسر، ڈاکٹر، جہانِ امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی، (حضرت مجدد الف ثانی اور دو قومی نظریہ) از: پروفیسر محمد اسلم، امام ربانی فاؤنڈیشن، ۲۰۰۵، کراچی، اقلیم جلد چہارم، ص: ۱۸۵۔

[12] محمد اقبال، علامہ، ڈاکٹر: کلیات اقبال، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۷ء، ص: ۴۵۱۔

[13] مسعود احمد، پروفیسر، ڈاکٹر، جہانِ امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی، (حضرت مجدد الف ثانی اور دو قومی نظریہ) از: پروفیسر محمد اسلم، امام ربانی فاؤنڈیشن، ۲۰۰۵، کراچی، اقلیم جلد چہارم، ص: ۱۸۶۔

[14] ایضاً۔

[15] ایضاً۔

[16] ایضاً۔

[17] *The Reconstruction of Religious thought in Islam*, P-152

[18] شاہین، ڈاکٹر رحیم بخش، اوراق گم گشتہ (اسلامک پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۷۹ء)، ص: ۱۷۴، خطوطِ اقبال (مرتبہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی)، ص: ۱۱۶۔

[19] مسعود احمد، پروفیسر، ڈاکٹر، جہانِ امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی، (حضرت مجدد الف ثانی اور دو قومی نظریہ) از: پروفیسر محمد اسلم، امام ربانی فاؤنڈیشن، ۲۰۰۵، کراچی، اقلیم جلد چہارم، ص:۱۸۶۔

[20] ایضاً۔

[21] ایضاً۱۸۸۔

[22] انصاری، محمد عبد الحق، ڈاکٹر، تصوف اور شریعت، ص:۴۳: ندوی، ابو الحسن، تاریخ دعوت و عزیمت، مجلس نشریات اسلام، کراچی، ۲/۲۶۱۔۲۵۹۔

[23] ایضاً۔

[24] ایضاً۔

[25] ایضاً۔

[26] ایضاً۔

[27] ایضاً۔

[28] ایضاً۔

[29] سرہندی، شیخ، احمد، مکتوبات امام ربانی، دفتر اول، مکتوب نمبر ۳۵۔

[30] دفتر اوّل، مکتوب نمبر ۲۶۴۔

[31] دفتر سوم، مکتوب نمبر ۲۷۔

[32] دفتر اوّل، مکتوب نمبر ۵۱۔

[33] دفتر اوّل، مکتوب نمبر ۱۰۵۔

[34] ایضاً۔

[35] دفتر اوّل، مکتوب نمبر ۲۱۹۔

[36] دفتر اوّل، مکتوب نمبر ۱۰۵۔

[37] دفتر اوّل، مکتوب نمبر ۴۶۔

[38] ایضًا۔

[39] دفتر سوم، مکتوب نمبر ۲۷۔

[40] ایضًا۔

[41] دفتر اوّل، مکتوب نمبر ۴۱۔

[42] دفتر دوم، مکتوب نمبر ۵۴۔

[43] دفتر اوّل، مکتوب نمبر ۱۶۱۔

[44] دفتر اوّل، مکتوب نمبر ۵۲۔

[45] ایضًا۔

[46] دفتر اوّل، مکتوب نمبر ۳۷۔

[47] دفتر دوم، مکتوب نمبر ۹۹۔

[48] دفتر اوّل، مکتوب نمبر ۲۴۔

[49] ایضاً۔

[50] دفتر اوّل، مکتوب نمبر ۳۵۔

[51] دفتر اوّل، مکتوب نمبر ۲۴۔

[52] دفتر اوّل، مکتوب نمبر ۲۰۶۔

[53] دفتر اوّل، مکتوب نمبر ۳۰۹۔

[54] دفتر اوّل، مکتوب نمبر ۱۵۴۔

[55] دفتر اوّل، مکتوب نمبر ۱۵۴۔

[56] ایضاً۔

[57] ایضاً۔

[58] ماخوذ از: ایمانیات از پروفیسر عبد الباری صدیقی، فرنگی محلی، مطبوعہ کراچی، ۱۹۸۵ء، ص:۱۳۳۔ ۱۴۸۔

[59] محمد اقبال، علامہ، ڈاکٹر، کلیات اقبال (ضربِ کلیم، کافر و مومن)، مکتبہ جمال لاہور، ۲۰۰۷ء، ص:۸۸۷۔